نظمِ قرآن ۔ تاریخ وتحقیق

احمد اقبال قاسمی

قرآن پاک ،علوم ومعارف کا بحر بیکراں اور علم وحکمت کا ایسا خزانہ ہے جس کے موتی کبھی شمار نہیں کئے جاسکتے ،ایک جہت سے وہ ایک سادہ سی کتاب ہدایت ہے جو انسانی زندگی کے لیے ایک جامع نظام پیش کرتی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر علم سے بحث کرتی ہے،مگر وہ رائج الوقت تقسیم علوم کے مطابق کسی خاص موضوع اور جزوی علم کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ اس علم ہدایت کا مرقع ہے جو تمام علوم اور انسانی قافلہ ہائے افکار کو عدل اور صراط مستقیم پر قائم رکھتا ہے وہ ایسا خوان کرم ہے جس کی نعمتیں کبھی کم نہیں ہوسکتیں اور ایسا چشمہ حیات ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے ،جتنی بار اسے تدبر اور فکر سے پڑھا جائے رموز وعجائب اور لطائف کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا کہ ''علماء کی طبیعت اس سے سیر نہیں ہوتی اور کثرت تلاوۃ سے پرانا نہیں ہوتا،اور اس کے عجائب نہ ختم ہونے والے ہیں۔(۱)۔

پھر ایک دوسری جہت سے غور کیا جائے تو یہ دنیا کی بہترین ادبی کتاب ہے،اس کا بالکل یگانہ نیا اور منفرد اسلوب ہے جس کی کوئی نظیر ہے اور نہ مثل ۔یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کے علم سے اتری ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات علم میں یکتا ہے اس کی کتاب کا اسلوب بھی یگانہ ہے ہم اسے الٰہی ادب کا عنوان دے سکتے ہیں۔انسانی تصانیف میں ہر علم کا اسلوب نگارش جدا جدا ہوتا ہے ۔ افسانہ نگاری اور تاریخ نویسی کا اسلوب مواعظ وحکم سے مختلف ہوتا ہے، قانونی دساتیر کا انداز بیان ،ماوراء طبیعات کے مباحث سے یکسر علیحدہ ہوتا ہے،غرض ہر علم وادب اپنا امتیازی اور جداگانہ طرز بیاں رکھتا ہے۔قرآن حکیم میں احکام اور شرائع بھی ہیں، اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات بھی، امثال اور خطب بھی، مواعظ اور تاریخ بھی ،معلومات غیبی بھی ہیں اور ابدی حقائق بھی،مگر قرآن ان سب ہی اصناف علوم کو ایک کل قرار دے کر گفتگو کرتا ہے اور زبان وادب کا ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے جو موضوعات کے اختلاف کے باوجود ایک سی یکسانیت رکھتا ہے اور کسی مرحلہ پر اس کی سحر طرازی، جاذبیت اور اثر آفرینی میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جو سب سے بڑا تحفہ اور عظیم عطیہ بخشا ہے وہ قرآن حکیم ہے۔اس عطیہ ربانی کے ساتھ جو خاص لگاؤ،محبت اور عشق کا مظاہرہ اس اُمت نے کیا ہے، دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔قرآن حکیم کی فصاحت وبلاغت، مطالب کی وسعت اس کے موضوعات کی گوناگوئی، دین اور فن کے حسین امتزاج اور دل آویز پیکر نے ہر عہد کے علماء اور فضلاء کے احساسات کو ابھارا اور انہوں نے اس ابدی کتاب میں مخفی خزانوں سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے۔قرون اولی سے لے کر دور حاضر تک ان گنت کتابیں قرآنی علوم ومعارف پر لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں۔کسی نے لغات ،لہجات اور مخارج حروف پر لکھا، کسی نے نحوی وصرفی خوبیوں اور صنائع وبدائع کو اپنا موضوع بنایا، کسی نے اصول دین، احکام اور قصص مرتب کرڈالے، کسی نے اقسام، امثال اور تصویر فی پر

خامہ فرسائی کی اور کسی نے فصاحت اور بلاغت کے محاسن اور مخفی گوشوں کو اجاگر کیا۔غرض قرآن حکیم کے معانی، طالب اور ادبی پہلوؤں کا کوئی ایسا گوشہ نہ رہا جس پر قابل قدر لٹریچر تیار نہ کرلیا گیا ہو۔

علوم قرآن کے ان موضوعات میں اعجاز بیان کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔اگر چہ اعجاز بیان قرآن پاک کی غایت نہیں ہے بلکہ کلام الٰہی کا لازمی وصف ہے۔اس اعجاز کے پیش بہا جلی اور خفی الوان ہیں، جن کا ہر پہلو اپنا الگ رنگ اور جدا حسن رکھتا ہے، ان میں سے ایک دلکش اور دقیق اعجاز قرآن کے اسلوب میں نظم کا اعجاز ہے۔اہل فن اسے ایک مستقل علم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جس وہ علم مناسبۃ سے تعبیر کرتے ہیں ۔زیر نظر مضمون میں اس علم کا تعارف ، ضرورت اور اہمیت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ **واللہ المستعان.**

علمِ مناسبة:

مناسبت کے لغوی معنی مقاربت اور مشاکلت کے ہیں۔اصطلاح میں اس سے مراد وہ علم ہے جو قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب میں نظم اور ان میں باہمی ربط وتعلق کی نوعیت اور حکمت سے بحث کرتا ہے۔(۲)۔ اس علم کی ضرورت اس حقیقت کے پیش نظر بڑھ جاتی ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب نزولی نہیں بلکہ توقیفی ہے اس لئے آیات اور سورتوں میں نظم اور ارتباط کا سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔قرآن حکیم میں مناسبت اور روابط کبھی جلی ہوتے ہیں، کبھی خفی ربط شاذ ہوتا ہے(۳)۔ سورتوں کے داخلی نظم میں زیادہ تر ایک مرکزی موضوع کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے پھر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ مربوط اور متصل ہوتی ہیں۔

جزئیات میں نظم اور ارتباط کی صورت کبھی یہ ہوتی ہے کہ بات ایک آیت سے مکمل نہیں ہوتی تو دوسری آیت سابقہ مضمون کی تکمیل، تفسیر یا بیان حصر اور استثناء کے لئے آتی ہے یا دوسری آیت تعلیل یا استدراک کے لئے ہوتی ہے اور کبھی نظائر، امثال اور تشبیہ یا تکرار کے قبیل سے ہوتی ہے اسی طرح ارتباط کی نوعیت کبھی مقابلہ اور مضادات کی ہوتی ہے۔جیسے صفات مومنین کے بعد صفات مشرکین، آیات ترغیب کے بعد آیات ترہیب، آیات کونیہ کے بعد آیات توحید وتنزیہ، بعض جگہ استرادیا حسن تخلص کی سامنے آتی ہے(۴)۔

کبھی پہلے عقل سے اپیل کی جاتی ہے اور پھر دل کو متوجہ کیا جاتا ہے اور احکام کے بیان کے بعد پند وموعظت کا درس دیا جاتا ہے۔غرض جب کوئی آیت کسی دوسری آیت کے ساتھ ملائی جاتی ہے تو اس میں گوناگوں مناسبتیں ہوتی ہیں اور ہر ترکیب اور ترتیب اپنے اندر نظم کا ایک نیا جلوہ اور حسن وجمال کا نیا رنگ رکھتی ہے، سورتوں کے تمام مضامین اپنے مرکزی موضوع سے منسلک ہوتے ہیں، فواتح سور اور ان کے خواتم کے مابین بھی ربط ہوتا ہے۔ان تمام وجوہ مناسبات کی معرفت سے قرآن حکیم کے اعجاز، بلاغت، معانی، نظم کلام اور عظمت اسلوب کا صحیح فہم اور شعور حاصل ہوتا ہے۔قرآن حکیم کا اسلوب بیان عرب قدیم کے نہج سے مطابقت رکھتا ہے۔قدماء عرب اپنے

کلام میں ادباء متاخرین کی طرح کالنظم اور تسلسل ملحوظ نہ رکھتے تھے۔(۵)۔

وہ حذف، ایجاز اور اختصار کو اپنے کلام کی خوبی سمجھتے تھے۔مفرد مضمون اور مستقل کلام کا طریقہ ان کے یہاں عام تھا۔ جزئیات کے بیان میں معنی خیز اشاروں سے کام لیتے اور ایماء کو تفصیل اور صراحت پر ترجیح دیتے تھے تاکہ تحلیل، مطلوبہ اثر خود حاصل کرلے۔قرآن کریم کا طرز نگارش اسی نہج کا مظہر ہے اور ایسا ہونا طبعی اور فطری تھا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو ان کی اپنی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا جو عین مصلحت اور حکمت کے مطابق تھا۔

فکر کا ارتقاء:

شروع میں قرآنی مباحث بڑی حد تک تفسیری احادیث، آثار اور اقوال صحابہ تک محدود تھیں جو فقہی احکام اور اسباب نزول سے متعلق ہوا کرتی تھیں، بعد میں ان کا دائرہ وسیع ہوا اور لغت اور معانی پر گفتگو ہونے لگی۔اسی طرح قصص قرآنی کی تشریح کے سلسلہ میں اسرئیلی مرویات بھی تفسیری ذخیرے کا حصہ بنیں۔

بنوامیہ کے عہد میں جو کتب تصنیف ہوئیں ان میں نقل پر اعتماد نمایاں تھا۔بنوعباس کے عروج کے ساتھ عرب وعجم کے اختلاط میں اضافہ ہوا تو مختلف ثقافتوں سے عربی فکر متاثر ہوئی اور ادباء میں وسعت نظر اور عقلیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔اسی طرح اہل تفسیر بھی قرآن حکیم کے ادبی جمال، بیانی اور معنوی محاسن کو اجاگر کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور تفسیری کتب کی تصنیف کا انداز بدلا۔

شیخ حفنی محمد شریف کے بیان کے مطابق ابوعبیدہ معمر ابن المثنی ۲۰۹ھ کی مجاز القرآن پہلی کتاب ہے جس میں فن تفسیر میں بیانی اور ادبی بحثوں کا دروازہ کھولا۔جبکہ ابن ندیم وراق نے اس ضمن میں شیخ قطرب (اصمعی) کی کتاب کو پہلی تصنیف قرار دیا ہے جسے شیخ نے بعض قرآنی آیات کے مابین تعارض اور تناقص کے اشکالات دور کرنے کے لیے لکھا تھا۔

اسی عہد کی ایک اور شخصیت فراء دیلمی ۲۰۷ھ نے تفسیر معانی القرآن لکھ کر بیان اور وجوہ نظم کے ان مباحث کی لغوی جہت سے تکمیل کی، جس کا آغاز ابوعبیدہ نے کیا تھا۔(۶)۔

فراء دیلمی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مکمل تفسیر قرآن لکھی۔(۷)۔

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں معتزلہ کے ایک امام ابراہیم نظام ۲۲۳ھ میں اعجاز قرآن کی بحث میں دلیل صرفہ پیش کی جس کی تردید میں اس کے شاگرد جاحظ نے نظم القرآن لکھی۔(۸)۔

اور قرآن کے اسلوب بلاغت کو معجزہ قرار دیا، غالباً جاحظ پہلے ادیب ہیں، جنہوں نے قرآن کے بلاغی اعجاز پر کتاب لکھی۔(۹)۔ اس کی تائید میں اور ادیبوں کے بھی قلم اٹھایا، محمد ابن اسحٰق ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں ایسی دو کتب کا ذکر کیا ہے، ایک کتاب نظم القرآن مصنفہ ابن الاخشیہ اور دوسری کتاب نظم القرآن مصنفہ ابوعلی الحسن بن علی بن نصر۔(۱۰)۔ مگر اسی موضوع پر جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ ابن قتیبہ ۲۸۶ھ کی تاویل مشکل القرآن۔(۱۱) ہے۔

ان تصانیف سے قرآن حکیم کے بیانی اعجاز کے دلائل میں بڑا اضافہ ہوا اور اس موضوع پر تالیفات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا یہ وہ زمانہ تھا جب علوم کی فن واری تقسیم کے خطوط اپنا نقش جما رہی تھی اور دوسرے علوم کی طرح قرآنی علوم میں بھی مختلف موضوعات پر تصنیف و تالیف کا رجحان بڑھا۔

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں محمد بن یزید الواسطی ۳۰۷ھ نے اعجاز کے مستقل عنوان سے اپنی کتاب ''اعجاز القرآن'' پیش کی جو غالباً جاحظ کی کتاب نظم القرآن کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔(۱۲)۔

اس تصنیف کے بعد یہ فکر عام ہوا کہ قرآن حکیم کا اصل اعجاز اس کے نظم اور اسلوب بلاغت میں ہے۔ الواسطی کے بعد ابوالحسن علی بن عیسی الرمانی ۳۷۴ھ کی کتاب "النکت فی اعجاز القرآن" سامنے آئی جس میں بلاغی اصولوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا اور قرآنی آیات کی مثالوں سے اعجاز بلاغت کو ثابت کیا، رمانی نے بلاغی اصولوں میں تاثیر نفوسی کے نکتہ کا اضافہ کی اور اسے بلاغت قرآن کا اہم نکتہ قرار دیا۔(۱۳)۔

تیسری صدی ہجری کے آخری تک جو کتابیں معرض وجود میں آئیں ان میں اعجاز کی بحث ایک خاص نہج سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ قدیم عربی زبان وادب میں تنقید کی کچھ حدود تھیں۔ ان کے مطابق کسی تصنیفی کام کے فنی محاسن جانچنے کے لیے ہر جز کا جداگانہ تجزیہ کیا جاتا تھا اور تحسین کلام کی وساطت سے نہیں جزو کی روشنی میں کی جاتی تھی۔ قرآن حکیم کے اعجاز بلاغت کے اثبات کے لیے جو کتب لکھی گئیں ان میں بھی یہی انداز غالب رہا، مگر زبان وادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں، اسلوب اور طریق تعبیر ہر دور میں یکساں نہیں رہتا، فصاحت و بلاغت کے سانچے بگڑتے اور سنوارتے رہتے ہیں، البتہ ہر زبان کے ادب کی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں، جنہیں زبان وادب کی روح سے تعبیر کیا جاتا ہے جن کا تعلق فکر کی وسعت، نظر کی گہرائی، زبان کی اثر انگیزی اور ادب کی لطافت سے ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اقدار عالیہ کا مظہر کامل بھی ہے۔ اور اسلوب قدیم کی خوبیوں کا جامع بھی قدیم شعراء وخطباء کے کلام میں بلاغت کا یہ معیار نہ تھا کہ اس میں ہر جگہ جلی ربط اور مناسبت موجود ہو ان کے یہاں حذوف اور ایجاز بہت عام تھا، وہ ایک بات کے بعد دوسری بات اس کی دلیل یا مثال یا اس کے نتیجے یا اس کی تکمیل اور استدراک کے طور پر لاتے تو اس رابطہ کو ظاہر کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ ان کا ذوق یہ تھا کہ ذہن جس قدر محذوفات کی تلاش میں رہے گا، اسی قدر لطف حاصل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک قدیم ادب کے ذوق کا غلبہ رہا، مفسرین کے یہاں آیات اور سورتوں کے مضامین میں باہمی ربط کی وجوہ پر گفتگو کرنے کا رجحان ناپید تھا۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے جن لوگوں کو اول اول مخاطب کیا وہ نازول آیات کے اسباب اور تاریخی پس منظر، حالات اور مسائل سے پوری طرح باخبر تھے۔ لطیف سے لطیف اشارات و کنایات کو سمجھنا ان کے لیے دشوار نہ تھا۔ ہر آیت کے محل اور مصداق تک پہنچ جاتے تھے، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے عہد تک ایسے ہی حالات رہے۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری کے آخر تک کسی ادیب اور مفسر نے مناسبت آیات کے اظہار کی ضرورت محسوس نہ کی، مگر پھر یہ

صورت باقی نہ رہی، ایک طرف اسباب نزول کی تفصیلات محفوظ نہ رہ سکیں۔(۱۴)۔

اور اس کے نتیجہ میں کلام کی مخفی کڑیوں سے عدم واقفیت بڑھی اور اشکالات کا موجب ہوئی تو دوسری طرف عجمی علوم وفنون کے تراجم ہوئے جس سے تصنیف وتالیف کے فن میں تنوع پیدا ہوا اور نئے نئے انداز داخل ہوئے۔ادب وزبان کے اسلوب اور تنقید کے اصول بدلے تو قرآن حکیم میں محاسن کی تلاش اجزاء کے ساتھ کل کی روشن میں بھی ہونے لگی اور آیات اور سورتوں میں باہمی مناسبات وروابط اور ان کے مجموعی سلسلہ پر غور وفکر کرنے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

چوتھی صدی ہجری کے ربع اول کے ایک محقق شیخ ابوبکر نیشاپوری ۳۲۶ھ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے آیات اور سورتوں میں مناسبات سے متعلق سوالات اٹھائے اور ان میں باہمی وجوہ اور حکمتوں پر بحث کا دروازہ کھولا اور اس جدید نہج سے قرآن کا مطالعہ کرنے پر زور دیا اور آپ اہل عراق کی اس علم سے غفلت برتنے کی شکایت فرمایا کرتے تھے۔(۱۵)۔

اسی صدی کے آخر میں ابوالفرح احمد بن مقری همدانی ۴۰۰ھ اس موضوع پر سب سے پہلی کتب علم المناسبۃ کے نام سے تصنیف کی۔(۱۶)۔

پانچویں صدی میں امام عبدالقاہر جرجانی ۴۷۱ھ نے دلائل الاعجاز لکھ کر ثابت کیا کہ بلاغت کلام کا اصل مرجع نظم کلام کے خصائص میں ہے پھر چھٹی صدی ہجری کے دو ممتاز مفسرین نے اس فکر کو وسعت دینے میں خاص توجہ دی، ان میں سے ایک امام جاراللہ زمخشری ۵۳۷ھ میں جنہوں نے مناسبات آیات کو بلاغت قرآنی کا جزو قرار دیا اور اس کے مخفی پہلوؤں کو اپنی کتاب تفسیر الکشاف میں بیان کیا۔(۱۷)۔

دوسرے محقق قاضی ابوبکر ابن العربی ۵۴۳ھ ہیں جو علم مناسبہ کو عظیم علم قرار دیتے ہیں۔اور وہ پہلے مفسر ہیں جو آیات میں اس درجہ ربط اور پیوستگی کے قائل ہیں فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کل ایک کلمہ واحدہ کی مانند ہے جس میں آیات باہم وحدت بسیط کی طرح مربوط ہیں۔(۱۸)۔

مگر مناسبات کی بحث کو سب سے زیادہ پیش رفت اور اہمیت امام فخرالدین رازی ۶۰۶ھ کی تفسیر مفاتیح الغیب سے حاصل ہوئی جس میں نظم اور روابط آیات پر خصوصی توجہ دے گئی ہے اور جملوں کی تقدیم وتاخیر صیغوں کے اختلاف، الفاظ کے وصل اور فصل کے ذرا ذرا سے فرق سے بے شمار اسرار ورموز بے نقاب ومعانی کی طرح معجزہ قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جو لوگ قرآن کے اسلوب۔(۱۹)۔

کو معجارہ مانتے ہیں اس سے ان کی مراد ترتیب اور نظم آیات ہی کا اعجاز ہے۔امام رازی اپنے پیش رو امام نیشاپوری کی طرح اپنے عہد کے مفسرین کی ملامت کرتے ہیں جو اپنی تنگئ نظر کے سبب اس علم کی قدر شناسی سے قاصر ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس باب میں اصل صورت حال کسی شاعر کے اس شعر کے مطابق ہے:

والنجم تستصغر الابصار رویته والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر (۲۰).

حضرت امام رازی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ قرآن حکیم کے اکثر لطائف اس کی ترتیبات اور روابط ودیعت ہیں۔

اس موضوع پر دوسری اہم تصنیف آٹھویں صدی ہجری کے شیخ ابوجعفر بن زبیر غرناطی ۷۰۸ھ کی ہے جس کا نام " ابرھان فی مناسبة ترتیب سور القرآن " (۲۱)۔ ہے۔

مگر اسی فن پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے اہم کتاب نویں صدی کے امام برہان الدین بن عمر البقاعی ۸۸۵ھ کی ہے۔ جس کا نام "نظم الدرفی تناسب الای والسور" ہے۔ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف پر ۱۴ سال صرف کئے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ صادق الرافعی کے مطابق اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ اسے وہ اسرار قرآن کا محیر العقول خزانہ قرار دیتے ہیں۔ (۲۲)۔

اسی صدی میں ہمیں برصغیر میں علامہ علاؤالدین مھائمی کا نام ملتا ہے۔ جنہوں نے مناسبات آیات ہی کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر مکمل تفسیر قرآن مرتب فرمائی اور اس کا نام "تبصیر الرحمان وتیسر المنان" رکھا۔ علامہ مھائمی نے اپنی تفسیر میں یہ التزام بھی فرمایا کہ ہر سورت سے پہلے آیت بسم اللہ کی تفسیر میں اس صورت کے مرکزی مضمون کو اجمالاً بیان کر دیا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے یہ تفسیر بے مثل ہے جیسا کہ حضرت مھائمی خود فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں ربط کلمات، نظم اور ترتیب آیات کے متعلق ایسے نکات اور لطائف جمع کر دیئے ہیں جو ان سے پہلے کسی کی دسترس میں نہ آ سکے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص احسان فرمایا اور انہیں یہ توفیق بخشی کہ نظم قرآن کے مخفی گوشوں کو ظاہر کریں اور ان کے جمال اور اعجاز کو آشکار کریں۔ (۲۳)۔

دسویں صدی ہجری میں حضرت علامہ جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ نے اس علم کی طرف خاص توجہ دی اور اس علم نے جو وسعت ان کے عہد تک اختیار کی تھی اسے سمیٹنے کی اہم خدمت انجام دی۔ اس موضوع پر پہلے انہوں نے اسرار التنزیل لکھی پھر مناسبات سور پر علیحدہ ایک کتاب "تناسق الدرفی تناسب السور" تحریر کی "الاتقان فی علوم القرآن" میں بھی ایک مستقل باب اسی موضوع سے متعلق ہے جس میں مناسبات اور ارتباط آیات کے وجوہ اور اسباب کے متعلق اہم اور مفید ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

اس صدی کے دو اور مفسرین خاص شہرت رکھتے ہیں، ایک مصر کے حضرت شمس الدین محمد بن الشربینی ۹۷۷ھ میں جن کی تفسیر السراج المنیر ہے اور دوسرے حضرت ابوالسعود حنفی ۹۸۲ھ ہیں ان دونوں بزرگوں نے اپنی تفاسیر میں ارتباط آیات پر خاص توجہ دی ہے۔

ان مفسرین کرام کے بعد ہماری نظر، برصغیر پاک و ہند کے عظیم محقق امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ پر رکتی ہے، جنہوں نے مناسبات اور نظم قرآن پر اصولی بحث اپنی نادر الوجود تصنیف الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں پیش کی ہے اور مناسبات کے سلسلہ

میں آپ کا موقف ابن العربی اور امام فخر الدین رازی سے مختلف ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں'' کہ قرآن مجید جس دور میں نازل ہوا اسی دور کی تصنیفی نکتہ سنجیوں اور تالیفی نزاکتوں کی رعایت اس میں کی گئی ہے، قرآن مجید میں ادباء متاخرین کے ادبی رجحانات اور تصنیفی قیود وشرائط کی تلاش بے سود ہے کسی کتاب کے ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے اور ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے ایک باب کا دوسرے باب سے ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبات کا پایا جانا عہد جاہلی یا قدیم عرب کے یہاں بلاغت کا جزو اعظم نہیں سمجھا جاتا تھا یہ شرطیں اور کتاب میں ادب کی یہ قدریں ادباء متاخرین کی پیدا کردہ ہیں۔ قرآن کے مخاطب اول عرب قدیم ہیں، انداز بیان میں ان کی رعایت کی گئی ہے، اس لیے آیات قرآنی میں ہر جگہ ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ پھر آپ یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ ''اگر پوچھا جائے کہ قرآن مجید میں ان مطالب ومفہوم کو بیان کرتے ہوئے ربط وترتیب کا پورا پورا لحاظ کیوں نہ کیا گیا'' اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں'' کہ اگر چہ خداوند تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہے یہ کوئی بعید بات نہ تھی لیکن موجودہ اسلوب کے مطابق قرآن کو مرتب ومربوط نہ پیش کرنے میں ایک حکمت ہے اور وہ یہ کہ اسلوب بیان، ادب وزبان میں اس کی رعایت مطلوب تھی جو قرآن کے مخاطب اول تھے''۔ (۲۴)۔

پھر آگے چل کر شاہ صاحب اس شبہ کا بھی ازالہ کرتے ہیں کہ کیا قرآنی تعلیمات کو ایسے اسلوب میں پیش کرنا بہتر نہ ہوتا کہ بعد کے ادوار میں اس کی بلاغت متاثر نہ ہو، آپ فرماتے ہیں کہ ''شریعت کے اسرار ورموز کو جاننے والا اس بات سے واقف ہے کہ انسانوں کی تربیت کون کون سی چیزیں بیان کرنی چاہئیں، ساتھ ہی علوم پنجگانہ پر بھی اس کی نظر ہو تو یقیناً اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن میں ان علوم کو پیش کرنے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس سے بہتر اور معیاری طریقے کا انتخاب ممکن نہ تھا'' ۔ (۲۵)۔

پھر آگے چل کر، آپ یہ وضاحت بھی فرماتے ہیں کہ'' قرآن کا اسلوب شروع سے آخر تک مکتوب یا پیغام کا سا انداز رکھتا ہے۔ (۲۶)۔

شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کے فکر کی ترجمانی آپ کے فرزند شاہ عبدالعزیز ۱۲۳۹ھ نے کی، اتباع شاہ ولی اللہ میں انہیں نظم اور ارتباط آیات سے خاص نسبت حاصل ہے۔ شاہ عبدالعزیز کی فارسی زبان میں تفسیر فتح العزیز لطائف وظرائف اور ربط آیات کا اعلیٰ مخزن قرار دی جاتی ہے۔ (۲۷)۔

اسی صدی میں بغداد کے مشہور عالم محمود آلوسی حنفی ۱۲۷۰ھ نے اپنی تفسیر روح، المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی'' مرتب فرمائی جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث کی جامع ہے، نظم وارتباط کو بھی بہترین عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ علامہ نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے۔

جدید مصر کی تفسیر سے متعلق تصانیف میں ایک نیا رنگ ابھرا ہے جسے ہم ادبی اور اجتماعی اسلوب کا نام دے سکتے ہیں اس طرز تفسیر کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ اس میں پرکشش انداز میں ان مطالب ومعانی پر توجہ دی گئی ہے جو قرآن کا اصلی مقصود اور

نصب العین ہے پھر عالم انسانیت کے اجتماعی اور عمرانی مسائل پر قرآنی نصوص کا اطباق کیا گیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ کو اس تفسیری مکتب فکر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔(۲۸)۔

آپ کے تفسیری لیکچروں کو آپ کے شاگرد علامہ رشید رضا قلمبند کرتے تھے اور المنار میں شائع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سورۃ النساء تک ہی پہنچا تھا کہ محرم ۱۳۲۳ھ کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ شیخ نے نظم قرآن سے متعلق محیر العقول حقائق کا انکشاف فرمایا اور ایسے اصول وضع فرمائے جس سے تفسیری رجحانات میں قابل قدر تبدیلی پیدا ہوئی۔ آپ کے منہاج کو آپ کے شاگرد رشید رضا ۱۳۵۴ھ اور محمد مصطفیٰ مراغی ۱۳۶۵ھ نے اپنی تفاسیر میں بڑی خوبی سے اپنایا۔ اس فن میں مکتبہ دیوبند کی درج ذیل چار اہم شخصیتوں نے اصولی خدمات انجام دیں ہیں۔

۱۔ شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کشمیری (۱۳۵۴ھ) جنہوں نے مناسبات کی بعض دقیق اور مشکل وجوہ کا حل تلاش کیا اور اہم نکات کا اضافہ کیا۔ ابن العربی اور امام رازی کی طرح آپ قرآنی مفردات، ترتیب، ترکیب اور حقائق و مقاصد سب ہی وجوہ سے قرآن حکیم کے اعجاز کے قائل ہیں۔(۲۹)۔

اپنے موقف کی تائید میں آپ نے مشکلات القرآن تحریر فرمائی۔ جیسے آپ کے شاگرد مولانا یوسف بنوری نے کچھ اضافہ کے ساتھ ''یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن'' کے عنوان سے ادارہ مجلس علمی کی طرف سے شائع کیا۔

۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی ۱۳۶۲ھ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں روابط آیات وسور کو خاص اہمیت سے پیش کیا اور اس خاص موضوع پر آپ نے اُردو میں ''سبیل النجاح''۔(۳۰)۔

اور عربی میں ''سبق الغایات'' کے عنوانات سے دو رسالے تحریر فرمائے اور سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک الگ الگ فصلوں میں ارتباط آیات پر ماخذ کے حوالوں کے ساتھ نافع اور مختصر گفتگو کی ہے۔ آپ حکمت، لطائف اور معارف کے اتھاہ سمندر میں غواصی کر کے اس سے بیش بہا موتی حاصل کئے اور دوسروں کو بھی معرفت اور استنباط کا سلیقہ سکھایا۔ آپ کے خلیفہ مفتی محمد شفیع نے معارف القرآن اور مولانا ادریس کاندھلوی نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں آپ ہی کے نہج اور اصولوں کی روشنی میں مناسبات اور روابط کی بحثوں کو آگے بڑھایا اور انوکھی توجیہات اور نکات کا اضافہ فرمایا۔

۳۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ۱۳۶۵ھ جو حکمت ولی اللہی کے امین تسلیم کئے جاتے ہیں، آپ نے قرآن حکیم میں نظم کے مسئلہ پر چالیس سال تک غور فرمایا، آپ فرماتے ہیں کہ ''میں نے شاہ ولی اللہ کی حکمت کی روشنی میں قرآن مجید کے چند مقاصد معین کئے ہیں پھر ان کے پیش نظر ہر سورت کے ایک خاص مرکزی مضمون کا تعین کیا ہے اور اس طرح سورتوں میں تسلسل قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔(۳۱)۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے املائی تفسیر مسمی ''المقام المحمود'' کے جامع ہیں آپ کے دوسرے شاگرد رشید موسیٰ جار اللہ ہیں جنہوں نے آپ

کے امالی تفسیر القرآن مرتب کئے ہیں اس کا ایک جزء جو سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ پر مشتمل ہے۔ ''الھام الرحمٰن فی تفسیر القرآن'' کے عنوان سے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی تحقیق اور عنایت سے حیدر آباد سے شائع ہوا ہے۔ موسیٰ جار اللہ نے نظم قرآن کے سلسلہ میں ''ترتیب السورہ الکریمہ فی النزول والمصاحف'' لکھی ہے جو بھوپال بھارت سے شائع ہوئی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے تفسیری کام پر ڈاکٹر منیر احمد مغل نے تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ سندھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

۴۔ مولانا حسین علی (متوطن واں بھچراں میانوالی، پنجاب) نے چالیس سال سے زائد عرصہ تک تفسیری موضوعات پر غور وفکر فرمایا۔ آپ نے تفسیری امالی آپ کے شاگرد محمد نذیر شاہ عباسی اور مولانا غلام اللہ خان نے مرتب کئے۔ ربط آیات وسور پر آپ کو خصوصی امتیاز اور مہارت حاصل ہے، اسی موضوع پر آپ کی یادگار تصنیف ''بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان'' ہے جس میں اول سورہ سے آخر تک، علیحدہ علیحدہ ارتباط اور تناسب پر سیر حاصل بحث پیش کی گئی ہے اور نظم قرآن کی بحث میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی تفسیر جواہر القرآن جسے آپ کے شاگرد غلام اللہ خان نے مرتب کیا ہے حال ہی میں اس کا ایک جزء شائع ہوا ہے۔

اکابرین دیوبند کی ان اہم شخصیات کے علاوہ اسی مکتبہ فکر سے فیض یاب دوسرے اصحاب نے بھی اس موضوع پر کام کیا ہے جن میں صوبہ سرحد ضلع مردان کے مولانا محمد طاہر مصنف ''سمط الدرفی ربط الآیات والسور وخلاصتھا المختصر لمن ارادان یتذکر او یتدبر'' اور مولانا عبدالسلام بن عبدالرؤف مصنف ''تنشیط الاذھان ومقدمہ التبیان فی اصول تفسیر القرآن'' قابل ذکر ہیں۔

برصغیر ہندوپاک کی ماضی قریب کی ایک اور شخصیت مولانا حمید الدین فراہی (۱۳۴۹ھ) ہیں جو نظم قرآن کے ماہر اور محرم راز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال پوری جانفشانی کے ساتھ تدبر قرآن پر صرف کئے اور وہ اپنے عمیق مطالعہ، عبقریت اور ذہانت کی بناء پر اپنے بہت سے معاصرین پر سبقت رکھتے ہیں۔ مولانا کا عقیدہ ہے کہ قرآن حکیم کی ہر سورہ کا ایک عمود یا مرکزی مضمون ہے جو طالب سورہ کی شیرازہ بندی کا کام دیتا ہے اس کے تمام مضامین کو ایک لڑی میں پرودیتا ہے اور تمام بکھرے ہوئے موتیوں کو جمع کر کے ان سے ایک خوبصورت ہار تیار کر دیتا ہے۔ عمود کا سررشتہ پوری سورت کو کثرت مضامین کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مولانا فراہی قرآن فہمی کے موقف کی وضاحت کے لیے آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں، تفسیر نظام القرآن، جس کے مقدمہ کے طور پر فاتحہ نظام القرآن کو شامل کیا، ربط ومناسبت کے اصولوں کی وضاحت کے لیے دلائل النظام، اسالیب پر ایک مستقل رسالہ اسالیب القرآن لغت سے متعلق مفردات القرآن، قرآن کے طرز استدلال پر ''حجج القرآن'' ا وراصول تفسیر پر ''التکمیل فی اصول التاویل الفرقان'' لکھا۔ (۳۲)۔

افسوس ہے کہ مولانا فراہی کی عمر نے وفا نہ کی اور اپنی اکثر تصانیف کی تکمیل نہ فرماسکے۔ آپ کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نظم قرآن کی بحث کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ مولانا اصلاحی نے گروپ کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نظم قرآن کی بحث کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ مولانا اصلاحی نے گروپ کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اس کا آغاز میں ایک یا ایک

سے مل کر زائد مکی سورتیں ہیں اور ہر گروپ کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ اس طرح مدنی سورتوں سے مل کر ایک گروپ بن جاتا ہے مولانا موصوف قرآن کی مجموعی سورتوں کو بھی سات گروپوں میں تقسیم کرتے ہیں ان میں ہر گروپ کا اپنا مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے وہ علامہ فراہی کی طرح عمود کا نام دیتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ہر گروپ کے مرکزی مضمون کے دو رخ ہیں، ایک رخ مکی سورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرا مدنی سورتوں میں، اس طرح دونوں مل کر مرکزی مضمون کی تکمیل کرتے ہیں، مولانا کا موقف یہ ہے کہ مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی، انفسی اور تاریخی دلائل وشواہد کا بیان ہے، یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، نظم وترتیب اور کلام کے منطقی تسلسل سے صحیح واقفیت کے بغیر دین واخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو سمجھنا دشوار ہے اسی طرح تاویل کے اختلاف کو رفع کرنے کے لیے سب سے اہم چیز عبارت کے سیاق وسباق اور نظام کی معرفت ہے۔ اگر سیاق اور نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مواقع پر ایک ہی قول اور ایک ہی توجیہہ کے سوا دوسرے کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ مولانا اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" ارتباط اور نظم کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

تاریخی مطالعہ کا حاصل:

علم مناسبۃ اور نظم کی ارتقائی تاریخی کے مطالعہ سے چند اہم نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں:

اول یہ کہ قرآن حکیم کا اسلوب قدماء عرب کے طرز نگارش اور نہج کے مطابق ہے مگر وہ بیان وبلاغت کی اعلیٰ ترین سطح اور ذوق کا نمونہ ہے اور تاثیر نفوس اور سحر طرازی کا ایسا معیار پیش کرتا ہے جس سے اہل عرب واقف نہ تھے، وہ لغت عربی کے مفردات کے موجد ضرور تھے بہت سے معاجم ان کے پاس تھے۔ مگر وہ معجم ترکیبی نہ رکھتے تھے، قرآن حکیم نے لغت کی تراکیب کو ایجاد کیا اور عربی زبان و ادب کو قرآنی اسلوب کو صورت میں ایسا معجم ترکیبی میسر آیا جو تمام فنون بلاغت کی اصل قرار پایا۔ (۳۳)۔

ثانیاً یہ کہ تمام فصحاء عرب، کافر اور مومن سبھی نے قرآنی بلاغت کو تسلیم کیا اور اپنے اعجاب، حیرت اور شدید تاثر کا اظہار کیا۔ عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن مغیرہ سرداران کفار میں سے اور اہل اسلام میں سے اشعر الشعراء لبید پھر بعد کے فصحاء میں سے ابن مقفع، عبدالحمید کاتب، سہل بن ہارون، الجاحظ ابن العمید اور ابن قتیبہ سب نے قرآن کی عظمت اور جلالت اسلوب کا اقرار کیا اور کسی کو نظم اور ارتباط کا کوئی اشکال لاحق نہ ہوا۔

ثالثاً یہ کہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے عہد سے لے کر تیسری ہجری کے آخر تک قرآن کے فہم اور اس کے بلاغی معیار کی تحسین کے لیے شعر اور کلام عرب کی طرف رجوع کرنے کا ذوق عام تھا جس کا آغاز حضرت عبداللہ بن عباس سے ہوا تھا۔ (۳۴)۔

شروع میں بڑی توجہ الفاظ اور جملوں کی ترکیب کی طرف رہی اور معانی القرآ، غریب القرآن، لغات القرآن اور لمصادر فی القرآن جیسے موضوعات پر تصانیف کا دور رہا، پھر اسلوب قرآن، جملوں کے معنوی نظم اور الفاظ کے معنوی روابط سے دلچسپی بڑھی اور مجاز القرآن، نظم القرآن اور مشکل القرآن جیسی تصانیف وجود میں آئیں۔ تیسری صدی کے آخر میں ہمیں مقدمہ تفسیر الطبری کی

صورت میں ان ساری کوششوں کے نتائج یک جا مل جاتے ہیں، اس عہد تک قرآن کے بلاغی مباحث کا دائرہ بڑی حد تک الفاظ، جملوں کی ترکیب مفرد مضامین کی لفظی اور معنوی خوبیوں تک محدود رہا ہے، ارتباط مضامین نظم اور مناسبات آیات وسور پر گفتگو کرنے کی طرف انہوں نے توجہ نہ کی۔

رابعاً تیسری صدی ہجری کے بعد جب آیات اور سورتوں میں نظم اور مناسبات سے متعلق گفتگو کا آغاز ہوا تو اس بحث سے شغف اور دلچسپی ان حلقوں میں زیادہ بڑھی جن کی نہاد عجمی تھی اور جو کلام کے منطقی تسلسل اور نظام کی باریکیوں اور اسرار وحقائق سمجھنے کی طرف زیادہ مائل تھے، اور چونکہ ان سارے مباحث کی بنا تو قیفی علم پر نہ تھی بلکہ اجتہاد اور قیاس پر مبنی تھی اس لیے دوسری بحثوں کی طرح تعبیر کے معاملہ میں بھی اہل علم نے الگ الگ موقف اور مسلک اختیار کر لیے جن کے تین مکاتیب فکر ابھر کر سامنے آتے ہیں، ایک مکتبہ فکر تو یہ ہے کہ آیات وسور میں نظم اور مناسبات کی تلاش ہی لا حاصل ہے ہر آیت مفرد اور مستقل مضمون رکھتی ہے۔ (۳۵)۔

ان کا موقف یہ ہے کہ جس طرح کائناتی تخلیق اور قدرتی مناظر میں کوئی ترتیب قائم نہیں ہے، کہیں ناہموار پہاڑی ہیں تو کہیں میدان، کہیں اونچی نیچی وادیاں ہیں تو کہیں ندی نالے، کہیں سرسبز جنگلات ہیں تو کہیں لق ودق ریگستانی سلسلہ، ان سب کی بے ترتیب میں ایک حسن ہے، قرآن حکیم کا حسن وجمال بھی آیات اور سورتوں کی مستقل حیثیت اور انفرادیت میں ہے، اجزاء کا انفرادی کمال بھی تکمیل حسن کی ایک صورت ہوتی ہے اور بعض جگہ تغایر اور تضاد بھی تخلیق حسن کا باعث ہوتا ہے اور جلالت مضمون کی وجہ سے پسندیدگی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ غالباً مفسرین کرام کا بہت بڑا طبقہ جس نے نظم اور مناسبات سے تعرض ہی نہیں کیا اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا مکتبہ فکر ان اصحاب کا ہے جو نظم اور مناسبہ کی تحقیق اور جستجو کی ستائش کرتے ہیں وہ نظم کی لطافت اور رموز کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ پورے قرآن حکیم کے اسلوب میں ادب قدیم کی رعایت رکھی گئی ہے اور قدماء عرب کے ادب مضامین کے مابین نظم وربط ہر جگہ ضروری نہ خیال کیا جاتا تھا، اس موقف کی حمایت کرنے والوں میں شیخ العز بن عبدالسلام۔ (۳۶)۔

۶۶۰ھ شیخ ولی الدین ملوی ابوالعلاء محمد بن غانم اور حضرت شاہ ولی اللہ جیسے حضرات شامل ہیں۔

تیسرا مکتبہ فکر یہ ہے کہ قرآن حکیم شروع سے آخر تک باہم مربوط ہے مضامین ومطالب کی بوقلمونی وگونا گونی کے باعث قرآنی اسلوب وانداز میں تغیرات پائے تو جاتے ہیں مگر تعبیر وبیان کا ایک ہی طریقہ رہتا ہے جو کبھی شدت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی نرم ہو جاتا ہے۔ گاہے مفصل ہوتا ہے اور گاہے مجمل، یہ تبدیلیاں مخاطبین کے حسب حال ہوتی ہیں مگر ہر جگہ جلی یا خفی نظم کا ایک سلسلہ ضرور ہوتا ہے۔ اس فکر کے بعض اصحاب قرآن میں اس درجہ نظم اور ربط کے قائل ہیں کہ انہیں قرآن مجید وحدت بسیط اور ہیئت موحدہ کی حامل کتاب نظر آتی ہے، ان کا موقف یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب، توقیفی ہے اور لوح محفوظ کے عین مطابق ہے۔ ترتیب نزولی اور ترتیب کتابت کا فرق اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آیات قرآنی میں باہمی نظم موجود ہے۔ ان کے نزدیک نظم کا سمجھ لینا ہی قرآن حکیم کی شاہ کلید کو پالینا ہے جس کے ذریعے اس کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں اور اسرار اور معارف کی بارش ہونے لگتی ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی

۵۴۳ھ پہلے امام ہیں جو اس عقیدے کے مدعی ہوئے کہ قرآن حکیم کل ایک کلمہ واحدہ کے مانند ہے۔ امام فخر الدین رازی نے آگے بڑھ کر اسلوب قرآن کے اس پہلو کو بھی اعجاز کا حصہ قرار دیا۔ امام علاء الدین مھائمی (۸۳۵ھ) ابوسعود حنفی (۹۸۲ھ) نے اپنی تفاسیر سے امام رازی کے فکر کی آبیاری کی، بعد کے فضلاء بھی اسی فکر کو وسعت دیتے رہے۔ چودھویں صدی ہجری کے فضلاء کی غالب اکثریت اسی مکتبہ فکر کی حامل ہے جن میں شیخ محمد عبدہ رشید رضا، محمد مصطفیٰ مراغی، انور شاہ کشمیری، عبید اللہ سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی اور حمید الدین فراہی قابل ذکر ہیں۔ (۳۷)۔

آخر الذکر حمید الدین فراہی نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ قرآن حکیم کے عمیق مطالعہ میں صرف کیا اور قرآن میں نظم کے اثبات کے لیے گراں قدر تحقیقی ذخیرہ چھوڑا۔ جس کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا فراہی کو اس خاص فکری میدان میں بہت سے علماء متاخرین پر سبقت حاصل ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرات قرآن حکیم میں نظم وارتباط کے حامی ہیں وہ پھر تحقیق، ارتباط اور نظم کی تلاش کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا گروہ ان اصحاب کا ہے جو آیات کو اس کے ماقبل سے وابستہ اور مربوط قرار دیتے ہیں اور پوری سورت کی آیات کو اسی نہج سے ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں جو سب مل کر ایک حلقہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ حضرت امام رازی سے لے کر ابوالسعود حنفی تک متقدمین کی اکثریت نے اسی نہج کو اختیار کیا ہے، حضرت مولانا اشرف علی ابوالکلام، مولانا عبدالحق حقانی، مفتی محمد شفیع، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے۔

دوسرا وہ طبقہ ہے جو سورت میں ایک مرکزی مضمون ایک دعویٰ ایک جامع عمود تلاش کرتے ہیں پھر اس سورت کے تمام اجزاء کو اس سے وابستہ قرار دیتے ہیں اس طریقہ کا آغاز ولی اللہی مکتبہ فکر کے عمائدین سے ہوا جسے بعد میں مولانا حسین علی، (صاحب بلغة الحیران فی ربط آیات الفرقان) مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے اور وسعت دی۔

.....☆☆☆☆☆.....